یوسف خان جذاب☆

علامہ اقبال کا تصور اجتہاد اور علماے کرام

اقبال بیسویں صدی کے بہت بڑے مفکر، فلسفی، شاعر اور مجتہد تھے۔ بیسویں صدی کے ذکر سے یہ مقصد نہیں ہے کہ اُن کی فکر اسی ایک صدی میں مقید تھی۔ یہ بات اُن کی ذات کے متعلق تو کہی جا سکتی ہے، لیکن جہاں تک اُن کی فکر کا تعلق ہے تو شاید جمود کے اس دور میں بھی اُن کی پرواز میں کوتاہی نہیں آئی ہے۔ اجتہاد کے حوالے سے اقبال کی فکر کی حکمرانی ان کے دور تک محدود نہیں ہے، یہ الگ بات ہے کہ ابھی تک ان کی فکر کو صحیح معنوں میں سمجھا نہیں گیا جو بلاشبہ مسلم امہ کے لیے ایک المیہ ہے۔

ماہنامہ 'الشریعہ' نومبر ۲۰۰۶ کے شمارے میں، اقبال کی فکر کے حوالے سے کئی مضامین سامنے آئے ہیں۔ مذکورہ شمارے کے نصف سے زیادہ صفحات میں فکر اقبال سے متعلق عموماً اور اُن کے اجتہادی نقطہ نظر سے متعلق خصوصاً لکھا گیا۔ رئیس التحریر جناب زاہد الراشدی صاحب نے بھی 'کلمہ حق' کو اقبال کے تصور اجتہاد کے حوالے سے ''چند ضروری گذارشات'' کے لیے مختص کیا ہے اور نہایت خوبصورتی سے علامہ اقبال کی فکری، فلسفیانہ، دانشورانہ اور شاعرانہ حیثیت پر روشنی ڈالتے ہوئے انگریزی استعمار کے دور میں اس فکری خلا کی نشاندہی کی ہے جو مسلمانوں کے جمود کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا۔ یہ مولانا صاحب کی وسیع النظری ہے کہ وہ اس خلا کے وجود کے معترف ہیں، ورنہ ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو کسی فکری خلا کے وجود کے ہی سرے سے انکاری ہیں۔ تاہم مولانا صاحب کا کہنا ہے کہ چونکہ اقبال خود مجتہد اور فقیہ نہ تھے اور نہ ہی اجتہاد اور فقہ سے ان کا عملی علاقہ رہا تھا، اس لیے وہ اجتہاد کے عملی پہلوؤں کے حوالے سے اقبال کی آرا پر اپنے تحفظات رکھتے ہیں۔ اس ضمن میں مولانا صاحب نے چند امور کی نشان دہی کی ہے جو بحث طلب ہیں۔ ذیل میں ہم جناب زاہد الراشدی صاحب کے پیش کردہ ان نکات پر ایک نظر ڈالیں گے۔

ا۔ اجتہاد مطلق کا دروازہ بند کیے جانے سے متعلق اقبال کے اعتراض کے جواب میں مولانا صاحب کا ارشاد ہے کہ اس کا تعلق اہلیت وصلاحیت کے فقدان سے نہیں بلکہ ضرورت مکمل ہو جانے سے ہے اور دیگر علوم وفنون کی طرح اجتہاد کے اصول وضوابط بھی، جو اساسی نوعیت کے ہوتے ہیں، طے ہو چکے ہیں اور غیر متبدل ہیں۔ اس کے خلاف یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ دین میں جو چیز بھی ابدی اور اٹل نوعیت کی ہوتی ہے، اس کے لیے قرآن پاک یا سنت نبوی سے صراحت پیش کرنا ہوگی۔ کیا مولانا صاحب اجتہاد مطلق کے متعلق ایسی کوئی تصریح پیش کر سکتے ہیں؟ ظاہر بات ہے کہ اجتہادی فیصلے چونکہ

☆ نار شکر اللہ۔ سرائے نورنگ۔ ضلع بنوں

قیاسی اور استنباطی ہوتے ہیں، اس لیے ان کی حتمیت پر اصرار نہیں کیا جا سکتا۔ ہوسکتا ہے کہ ایک مسئلے کے حل کے بارے میں ارباب علم متفق ہو جائیں، لیکن ہر حال میں یہ اتفاق ضروری نہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جن اصول و ضوابط کو مولانا صاحب نے ''اساسی قوانین'' کہا ہے، انہیں یہ بنیادی حیثیت کس نے دی ہے؟ اگر وہ فرمائیں کہ تاریخ نے ثابت کر دیا ہے تو اس ضمن میں یہ پوچھا جائے گا کہ ان پانچ چھ فقہی مذاہب کے علاوہ دیگر بیسیوں فقہی مذاہب کے پیرو کاروں کے ساتھ، جو اُن کے بقول تاریخ کی نذر ہو گئے، اللہ تعالیٰ کیا معاملہ فرمائیں گے؟ انہوں نے بھی تو ان اجتہادات سے انحراف کیا تھا۔ یہ سوال اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ ان اجتہادات کا اقرار یا انکار صرف تاریخ کا معاملہ نہیں کہ فلاں فقہی مذہب عملی لحاظ سے دوام حاصل کر گیا اور فلاں ناکام ہو گیا، بلکہ یہ ہماری اُخروی زندگی سے بھی متعلق ہے۔ ممکن ہے مولانا صاحب اس دور کو فقہی قوانین کی تشکیل کا عبوری دور قرار دے کر دیگر مذاہب کے پیروکاروں کے لیے نجات کی راہ نکال لیں مگر میری الجھن یہ ہے کہ یہی دور حتمی کیوں ہے؟ اسلام میں اجتہاد کا وجود اسے ایک متحرک (Dynamic) مذہب ثابت کرتا ہے اور اس تحرک کی بنا پر ہی اسلام تمام زمانوں کے لیے ہے۔ اجتہاد کو فقط ایک دور تک محدود کرنا، اس کی حرکت کو جمود میں تبدیل کرنے کے مترادف ہے۔ شاید الطاف احمد اعظمی صاحب نے اس لیے لکھا ہے کہ:

> ''قیاسی احکام حالات اور ظروف زمانہ کے تابع ہیں اور ان کی تبدیلی سے وہ بھی تبدیل ہو جائیں گے یا یوں کہہ لیں کہ اُن کی اطلاقی صورتیں بدل جائیں گی۔ اس سلسلے میں حنفی فقہا کا رویہ ماضی کی طرح آج بھی قابل اعتراض ہے۔ انہوں نے حنفی فقہ کو، جو زیادہ تر قیاسی اور استدلالی احکام پر مشتمل ہے، ناقابل تغیر سمجھ لیا ہے۔'' (۱)

اگر بقول مولانا صاحب ان اساسی قوانین کی حیثیت اب ناقابل تغیر ہے اور ان کی تشکیل کا فقط ایک ہی دور تھا تو خود حضور نبی کریمؐ اور صحابہ کرامؓ کے دور ہی میں ان اصول اور ضوابط کو طے کیوں نہیں کر دیا گیا، کیونکہ وہ بہر طور دین کو بہتر طریقے سے سمجھ سکتے تھے۔

۲۔ رئیس التحریر نے لکھا ہے کہ اقبال نے اجتہاد کا خطبہ دیتے وقت ترکی کی جدیدیت کو سامنے رکھا تھا۔ گزارش یہ ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا لکھاری بھی اپنے ماحول سے اوپر اُٹھ کر نہیں لکھتا۔ بیسویں صدی کے ربع اول میں ترکی اندھی تقلید سے اپنے آپ کو آزاد کرنے کے لیے تگ و دو کر رہا تھا۔ اقبال نے ترکی کی اس کاوش کو بنظر تحسین دیکھا کیونکہ اقبال کے مطابق مرد مومن اپنی خودی کو اسی وقت مستحکم کر سکتا ہے جب اس میں حریت اور آزادی کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہو اور وہ روایات کے شکنجوں کو توڑ سکتا ہو۔ ترکی اس وقت بلاشبہ اس اندھی تقلید کے بت کدوں کو پاش پاش کر رہا تھا۔ ترکوں کے اس اقدام کو اقبال نے یوں سراہا ہے:

> ''دراصل یہ صرف ترک ہیں جو امم اسلامیہ میں قدامت پرستی کے خواب سے بیدار ہو کر شعور ذات کی نعمت حاصل کر چکے ہیں۔ یہ صرف ترک ہیں جنھوں نے ذہنی آزادی کا حق طلب کیا ہے اور جو ایک خیالی دنیا سے نکل کر اب عالم حقیقت میں آ گئے ہیں۔'' (۲)

اقبال مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے خواہاں تھے اور نشاۃ ثانیہ کے لیے اندھی تقلید سے آزاد ہونا ناگزیر ہے۔ ترکی اس وقت قدامت پسندی کے خلاف لڑ رہا تھا اور اقبال کے مطابق قدامت پسندی اور روایت پرستی ہی مسلم امہ کے زوال کا سبب تھی، چنانچہ ترکوں کی، فرسودہ روایات سے بغاوت اور ان کی عقلی پیش رفت ان کے خیالی دنیا سے نکل کر عالم حقیقت میں

آنے کے مترادف تھی۔ اقبال کا خطبہ اجتہاد محض ترکی کی جدیدیت کی نقالی نہیں ہے۔ انہوں نے ترکی کے مشہور شاعر ضیا سے، جس کا حوالہ بار بار خطبہ اجتہاد میں آیا ہے، جہاں ضروری تھا اختلاف بھی کیا ہے۔ اقبال ترکی کی جدیدیت کے کہاں کہاں خلاف تھے، طوالت کے خوف سے اس بحث سے صرف نظر کیا جاتا ہے۔ اقبال اس اجتہاد کے حق میں تھے جس میں اسلامی روح سرایت کر چکی ہو۔ ترکی اس وقت لا کے صنم کدوں کو توڑ چکا تھا، تاہم الا کے معبد تعمیر نہیں کر سکا تھا۔ اس لیے اقبال نے اس خدشے کا اظہار کیا:

''آزاد خیالی کی یہی تحریک اسلام کا نازک ترین لمحہ بھی ہے۔ آزاد خیالی کا رجحان بالعموم تفرقہ اور انتشار کی طرف ہوتا ہے، لہٰذا نسلیت اور قومیت کے یہی تصورات جو اس وقت دنیائے اسلام میں کارفرما ہیں، اس وسیع مطمح نظر کی نفی بھی کر سکتے ہیں جس کی اسلام نے مسلمانوں کو تلقین کی ہے۔''(۳)

ترکی کی جس لادینیت کو مولانا صاحب اور الطاف احمد اعظمی صاحب (۴) اقبالی فکر کے شجرۂ طوبیٰ کے برگ و بار قرار دیتے ہیں، اقبال نے پیشگی طور پر اس کی اطلاع دے کر ان کے اس خیال باطل کی بساط الٹ دی تھی۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''پھر اس کے علاوہ یہ بھی خطرہ ہے کہ تمہارے مذہبی اور سیاسی رہنما حریت اور آزادی کے جوش میں، بشرطیکہ اس پر کوئی روک عاید نہ کی گئی، اصلاح کی جائز حدود سے تجاوز کر جائیں۔''(۵)

اقبال ترکی کی ایسی کسی پیش رفت کو قبول کرنے کے حق میں نہ تھے جس سے وہ اسلامی روحانیت سے محروم ہو جائیں۔ جاوید نامہ کے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں جن میں ترکی کی اس بے مہار آزادی کو ہدف تنقید بنایا گیا ہے:

مصطفیٰ کو از تجدد می سرود — گفت نقشِ کہنہ را باید زدود
نو نگر دد کعبہ را رخت حیات — گر زافرنگ آیدش لات ومنات
تُرک را آہنگ نو در چنگ نیست — تازہ اش جز کہنہ افرنگ نیست
سینہ او را دمے دیگر نبود — در ضمیرش عالمے دیگر نبود
لاجرم باعالم موجود ساخت — مثل موم از سوز ایں عالم گداخت
طرفگی ہا در نہاد کائنات — نیست از تقلید تقویم حیات
زندہ دل خلاق اعصار ودہور — جانش از تقلید گردد بے حضور
چوں مسلماناں اگر داری جگر — در ضمیر خویش ودر قرآں نگر
صد جہانِ تازہ در آیات او ست — عصرہا پیچیدہ در آنات او ست
یک جہانش عصر حاضر را بس است — گیر اگر در سینہ دل معنی رس است
بندۂ مومن زآیات خدا ست — ہر جہاں اندر بر او چوں قبا ست
چو ں کہن گردد جہانے در برش — می دہد قرآں جہانے دیگرش (۶)

یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ کمال اتاترک کے نام کے ساتھ اقبال نے ''ایدہُ اللہ بنصرہ العزیز'' لکھا تھا (۷) مگر جب اس کی جدیدیت دائرہ اسلام سے متجاوز ہونے لگی تو اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ چنانچہ اگر اقبال ترکوں کی آج کی لادینیت کا مشاہدہ فرماتے تو ان کو بھی ویسے ہی ہدف تنقید بناتے جیسا کہ انہوں نے مصطفیٰ کو بنایا۔ اقبال کے سامنے اس

وقت فقط ترکوں کی قدامت پسندی اور روایت پسندی کے خلاف بغاوت تھی اور انہوں نے اُن کے اسی پہلو کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔

۳۔ مولانا صاحب نے تیسرا نکتہ یہ اٹھایا ہے کہ اقبال کے خطبہ اجتہاد پر پون صدی گزر چکی ہے اور اب دنیا نئے حالات سے گزر رہی ہے، اس لیے ہمیں اپنے مسائل کو نئے حالات کے تناظر میں دیکھنا چاہیے۔

اس ضمن میں ہماری گزارش یہ ہے کہ جو طبقہ ماضی کے اجتہادات کو حتمی تصور کرتا ہے، وہ جدید عالمی تناظر اور بین الاقوامی ماحول میں اپنی ضروریات اور ترجیحات کا ازسرنو جائزہ کیسے لے سکتا ہے؟ عباسی دور میں مرتب شدہ فقہی اصولوں اور جزئیات میں محصور رہ کر جو ''اجتہاد'' بھی کیا جائے گا، اس کا حشر اس کانفرنس سے مختلف نہیں ہوگا جو گزشتہ سال بھارت میں ایک مذہبی ادارے نے منعقد کی تھی۔ اس میں ٹیلی ویژن اور تصویر سے متعلق علما کی ''اجتہادی'' آرا کی ایک جھلک 'الشریعہ' کے گزشتہ شماروں میں دیکھی جا سکتی ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ علما ابھی تک اجتہاد کے متعلق اقبال کے موقف کو نہیں سمجھ سکے۔ تاریخ کوئی سیلاب نہیں ہے جو ہنگامی طور پر غارت گری کر کے گزر گیا اور بس۔ اس کی کڑیاں حال اور مستقبل میں پیوست ہیں۔ اس سلسلے میں ہم ماضی سے چشم پوشی نہیں کر سکتے۔ خصوصاً اس صورت میں جب کہ ہم نے حال تو درکنار، ماضی کے مسائل کا حل بھی نہ ڈھونڈا ہو۔ اگر ہم حال کے مسائل پر واقعی غور وفکر کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے ہمیں اقبال کے اس خطبے کا ازسرنو جائزہ لینا ہوگا اور اس کے متعلق اپنے موقف پر نظر ثانی کرنا ہوگی۔ الطاف احمد اعظمی صاحب نے اقبال کے دوسرے خطبوں کا بہت سخت تنقیدی جائزہ لیا ہے، تاہم اس خطبے میں وہ اقبال سے بڑی حد تک متفق دکھائی دیتے ہیں۔ میری نظر میں عصر حاضر کا سب سے بڑا تقاضا یہ ہے کہ علما اجتہاد کا بند دروازہ دوبارہ کھولنے کے لیے تگ ودو کریں۔ اسی صورت میں وہ اس فکری خلا کو پُر کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے جو مسلسل بڑھتا جا رہا ہے۔ جب تک یہ قدم نہیں اُٹھایا جاتا، ہم کولہو کے بیل کی طرح اقبال کے خطبہ اجتہاد ہی کا طواف کرتے رہیں گے۔

حوالہ جات:

۱۔ اعظمی، الطاف احمد، ''خطبات اقبال۔ ایک مطالعہ'' (دارالتذکیر لاہور، ۲۰۰۵ء) ص: ۲۳۸

۲۔ نذیر نیازی، سید (مترجم)، ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ''، طبع دوم (بزم اقبال، لاہور، ۱۹۸۳) ص: ۲۵۰

۳۔ ایضاً، ص ص: ۲۵۱، ۲۵۲

۴۔ اعظمی، الطاف احمد، ''خطبات اقبال۔ ایک مطالعہ''، ص: ۲۱۷

۵۔ نذیر نیازی، سید (مترجم)، ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ''، ص: ۲۵۲

۶۔ محمد اقبال، ''جاوید نامہ''، طبع ہفتم، (شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۷۸ء) ص: ۶۶

۷۔ سلیم چشتی، پروفیسر، ''شرح جاوید نامہ''، طبع اول (عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، ۱۹۵۶ء) ص ۶۰۱